انسانِ مطلوب

خرم مرادؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانِ مطلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ انسان کیسا ہونا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے، جس کے لیے اس نے اپنی رضا اور جنت کا وعدہ کیا ہے اور جو اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے درکار اور مفید ہے اور یہ بھی کہ تربیت کے عمل کے اثر سے، وہ عمل، جو ہم انفرادی طور پر کریں اور وہ عمل، جو اجتماعی طور پر ہو، دونوں کے نتیجے میں کیسا انسان مطلوب ہے۔

یہ انسان ان مقاصد کے لیے بھی درکار ہے، جو ایک تحریک یا تنظیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ کسی اجتماعیت کی قوت بھی، ایسے ہی انسانوں کی موجودگی پر منحصر ہے، جو اس کو مطلوب ہیں۔ آخرت کے لیے تو ظاہر ہے کہ ایک ایسی تنظیم اور ایسی اجتماعیت کو، جو اقامت دین کی جدوجہد کی علم بردار ہو، وہی انسان بنانا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور جو اس کی رضا اور جنت کا مستحق ٹھیرے۔

انسان سے مراد دراصل انسان کا کردار، اس کی سوچ اور اس کا عمل ہے۔ اس کی شکل و صورت، لباس اور وضع قطع پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ اس کا کردار مطلوب ہے۔ کردار کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے مختلف حالات میں، جس میں کھنچاؤ اور تناؤ بھی ہوگا اور مشکلات اور مصائب بھی، نعمتیں اور فراوانیاں بھی ہوں گی اور ترغیب و تحریص اور خوف بھی۔ کس شخص کا کیا رویہ سامنے آتا ہے۔ ان حالات میں کسی شخص کے بارے میں یہ اعتماد اور بھروسا ہو کہ وہ کیا کرے گا، کس طرح سوچے گا اور کس طرح عمل کرے گا یا بالعموم اس کی روش اور سوچ کیا ہوگی؟ اس کا نام کردار ہے۔ بالعموم کا لفظ میں نے خاص طور پر اس لیے استعمال کیا ہے کہ کردار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان لازماً ہمیشہ ایک ہی طرح سوچے گا اور ایک ہی طرح عمل کرے گا۔ بلکہ اس میں کمی بیشی بھی ہوسکتی ہے اور انحراف بھی۔

کردار کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ، جب وہ محسوس کرے کہ وہ اس طرح نہیں سوچ رہا یا

اس طرح کام نہیں کر رہا، جیسا کہ مطلوب ہے، تو وہ فوراً اپنی اصل کی طرف لوٹے، اس کو اپنی سوچ یا عمل پر ندامت ہو، اس کی اصلاح کرے اور اپنے آپ کو صحیح راستے پر لگائے۔ کسی ایسے انسان کا نقشہ ہمارے سامنے نہیں ہے، جس سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہ ہو یا جس میں کوئی خامی نہ ہو یا، جو ہمیشہ مطلوبہ معیار کے اوپر رہے یا اگر کسی معیار پر پہنچ بھی جائے، تو اس کے سامنے وہی معیار مطلوب ہو اور اسی پر پہنچنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اگر وہ معیارِ مطلوب سے ہٹے یا نیچے گرے، تو وہ اس کی تاویل نہ کرے اور نہ اس کو صحیح قرار دے، بلکہ اسے چاہیے کہ تسلیم کرے کہ اس کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ اپنی اصلاح کی امکانی کوشش میں لگا رہے۔ قرآن مجید میں مومن، مسلم، متقی اور محسن کی، جو بھی تعریف کی گئی ہے وہ دراصل اسی انسانِ مطلوب کا خاکہ اور نقشہ ہے۔

جس طرح ایک بیج سے درخت اگتا ہے، اس کا ایک تنا ہوتا ہے اور اس کی کچھ بڑی بڑی شاخیں ہوتی ہیں اور پھر اس پر بے شمار چھوٹی چھوٹی شاخیں، پتے اور پھل، پھول لگتے ہیں، اسی طرح دین کا بھی ایک نظام ہے۔ اس کی جڑ ایمان ہے اور اس کے بعد زندگی کا ایک بھرپور ڈھانچا اور نظام اور ایک دینوی فریم ورک ہے۔ جو شخص بھی گہری نظر سے قرآن مجید اور حدیث کا مطالعہ کرے گا، وہ اس فریم ورک کو بڑی آسانی کے ساتھ پاسکتا ہے۔ میں نے اسی فریم ورک کو آپ کے سامنے رکھنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اس فریم ورک کے تحت، جو چیزیں میں آپ کے سامنے رکھوں گا، یہ دین میں بالکل بنیادی اور اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ میں انھیں صرف بنیادی اہمیت کے تقاضوں کے پیش نظر ہی سامنے نہیں رکھ رہا بلکہ قرآن مجید اور احادیث میں دین کے جتنے بھی احکام ہیں اور مومن کی، جو صفات بیان کی گئی ہیں ان کا اکثر و بیشتر حصہ اسی فریم ورک سے ماخوذ ہے۔ اگر آدمی ان بنیادی باتوں کو سامنے رکھے تو تفصیلات میں اس کا مزاج، اس کی عقل اور اس کا دل خود بہ خود اس کی رہ نمائی کرے گا کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے۔ پھر دین کے بہت سارے احکام، جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر مبنی ہیں اور مفصل بھی ہیں اور زندگی کے بہت سے دائروں میں پھیلے ہوئے ہیں خواہ، وہ نکاح و طلاق کے مسائل ہوں یا وراثت کے، اجتماعیت کے آداب ہوں یا باہمی تعلقات کے، سب کے سب انھی بنیادی باتوں اور فریم ورک پر مشتمل ہیں اور بہ آسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان بنیادی نکات کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ دین کو

جس قسم کا انسان، مطلوب ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، وہ انھی صفات سے بنتا ہے اور انھی چیزوں کو اختیار کرنے سے اس کی تعمیر ہوتی ہے۔

ا۔ تصدیقِ حق

اس ضمن میں پہلی بات وہ ہے، جسے ہم قرآن کی زبان میں تصدیقِ حق کہہ سکتے ہیں، جس کے معنیٰ ہیں حق کو سچ تسلیم کرنا اور ماننا، اس لیے کہ دین سراسر حق اور سچائی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات میں اصل حقیقت ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ (الحج ۲۲:۶)

''یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے۔''

زمین اور آسمان کو بھی، حق کے اوپر قائم کیا گیا ہے۔ حق کا قیام، حق کی شہادت، اقامتِ حق اور حق کا غلبہ، یہ الفاظ ہم دن رات بولتے ہیں۔ دراصل قرآن مجید اسی حق کی تعلیم دینے کے لیے آیا ہے۔ دین اسی لیے حق سراسر حق ہے کہ وہ، اسی حق کا علم بردار ہے۔ لیکن جب قرآنِ مجید تصدیق کا لفظ استعمال کرتا ہے، تو اسے ان محدود معنوں سے بہت زیادہ وسیع معنوں میں لیتا ہے جن معنوں میں اردو میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ کسی بات کی تصدیق کر دینا کہ یہ سچی ہے اور زبان سے کہنا کہ یہ بات صحیح ہے۔ یہ تصدیق کا وہ مفہوم نہیں ہے، جن معنوں میں قرآن اور حدیث میں اس لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔

تصدیق کے اندر پہلی چیز یہ شامل ہے کہ حق کی پیاس اور تلاش ہونی چاہیے۔ کوئی مسئلہ وسیع تر تناظر میں درپیش ہو، یا کوئی چھوٹا سا معاملہ پیش آجائے اور اس کا تعلق خواہ تعلقات سے ہو، خواہ قانون سے، معاملات سے ہو یا تنظیم سے، سچائی اور حقیقت کی تلاش ہی پیشِ نظر ہونی چاہیے اور اسی کی پیاس ہونی چاہیے۔ اس سے بے نیازی اور استغنا، دراصل کردار کی بالکل متضاد صفت ہے:

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰیO لا وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰیO لا

(اللیل ۹۲:۵،۶)

''تو جس نے [راہِ خدا میں] مال دیا اور [خدا کی نافرمانی سے] پرہیز کیا، اور بھلائی کو سچ مانا۔''

وَ اَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَ اسْتَغْنٰىۙ وَ كَذَّبَ بِالْحُسْنٰىۙ (اللیل۹۲: ۸، ۹)

''اور جس نے بخل کیا اور [اپنے رب سے] بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا۔''

یہاں قرآنِ مجید نے مطلوبہ کردار کو سمیٹ کر، تین صفات سے ظاہر کیا ہے اور کردار نامطلوب کو، تین دیگر صفات سے ظاہر کیا ہے۔ گویا اِستغنا اور بے نیازی، اس انسان کے اندر نہیں ہوسکتی، جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ اس کے برعکس اس کے اندر سچ کی پیاس، طلب اور تلاش و جستجو کا جذبہ ہونا چاہیے۔ یہ روش جہاں زندگی کے بڑے بڑے مسائل میں، مثلاً کائنات کی حقیقتوں کے بارے میں ہونی چاہیے وہاں چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی ہونی چاہیے۔ ہر جگہ مسلمان، اس بات کی تلاش اور جستجو کرتا ہے کہ حق اور سچ کیا اور کہاں ہے۔

تصدیق کے ضمن میں تلاش کے بعد دوسری چیز، ماننا اور قبول کرنا ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی تلاش اور جستجو کے بعد حق کو پالے اور پہچان بھی لے، لیکن اس کے بعد اس کو ماننے سے یا تو انکار کردے یا اس سے اعراض برتے اور کنارہ کشی اختیار کرے۔ گویا وہ مسلمان، جو انسانِ مطلوب ہے، وہ نہ صرف یہ کہ حق کی تلاش کرتا ہے، اس کی جستجو کرتا ہے، اس کو اس کی پیاس ہوتی ہے، بلکہ جب وہ، اس کو پاتا ہے تو، اس کو قبول بھی کرتا ہے اور مانتا بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ وہ، اس حق کے اوپر جم جاتا ہے، اس پر قائم ہوجاتا ہے اور استقامت اختیار کرتا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَۚ (الاحقاف ۴۶: ۱۳)

''یقیناً، جن لوگوں نے کہہ دیا اللہ ہی ہمارا رب ہے، پھر اس پر جم گئے، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

گویا، اس سے مراد وہ لوگ ہیں، جو حق کے اوپر جم گئے، انھوں نے اپنے عمل سے، مصائب و مشکلات اور مخالفتوں کے مقابلے میں نقصانات اٹھا کر اور ترغیب و تحریص کے باوجود، جم کر مقابلہ کیا اور

استقامت دکھائی۔ تصدیقِ حق کی یہ تشریح قرآن مجید میں بہت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور تقویٰ کی بنیادی صفت بھی یہی بیان ہوئی ہے:

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ○

(الزمر ۳۹:۳۳)

''اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچ مانا، وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔''

قرآن مجید میں اس حق کو ماننے اور پہنچانے پر بہ کثرت زور دیا گیا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک وہ بار بار اسی کی تاکید کرتا ہے۔ اس سلسلے میں، جو باتیں بالکل بنیادی ہیں، اس میں سے پہلی بات یہ ہے کہ وہ یہ اعلان کرتا ہے کہ حق تو بالکل آشکار ہے۔ وہ حق، جو کائنات کی بنیادی حقیقتوں سے متعلق ہے وہ روز روشن کی طرح آشکار ہے اور زمین و آسمان کی ہر چیز، اس کے اوپر گواہ ہے۔ وہ بار بار کائنات کے مظاہر کو، چاند اور سورج کو اور ہواؤں کو بہ طور گواہ پیش کرتا ہے اور یہ واضح کرتا ہے کہ کائنات میں جدھر بھی نگاہ اٹھا کر دیکھو گے، حق اور سچائی کا جلوہ پاؤ گے بہ شرطے کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ان سے دیکھو، کان کھلے رکھو اور ان سے سنو، دماغ کو کھلا رکھو اور اس سے سوچو۔ وہ بار بار غور و فکر اور تدبر کی دعوت اسی لیے دیتا ہے کہ دراصل، جو حق کا طالب ہوگا وہ اپنی آنکھیں، کان اور دل و دماغ کھلا بھی رکھے گا اور ان کو استعمال بھی کرے گا۔ حق تو فطرت سے بالکل مطابقت رکھتا ہے۔

انسان، جب بھی کھلے دل و دماغ کے ساتھ غور کرے گا تو ہمیشہ حق اور سچائی کو پائے گا اور ایسا نہیں ہوگا کہ اس کو اس کے لیے اندھی تقلید کرنا پڑے، دل و دماغ بند کر کے کسی بات کو ماننا پڑے یا اپنی فطرت کے خلاف کسی بات کو تسلیم کرنا پڑے۔ اس کے مقابلے میں، جو لوگ کانوں سے نہیں سنتے، آنکھوں سے نہیں دیکھتے اور دل و دماغ سے نہیں سوچتے ان کو قرآن مجید جانور کے مانند قرار دیتا ہے۔ انسان ہونے کا یہ تقاضا ہے کہ انسان غور کرے، سوچے اور جب بھی وہ غور کرے گا یا سوچے گا تو لازماً وہ حق کو پا لے گا۔ بہ شرطے کہ وہ ان شرائط کے ساتھ سوچے اور غور کرے، جو اس کے لیے ضروری ہیں۔

حق کی راہ میں رکاوٹیں

اس کے بعد وہ، اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ حق تک پہنچنے میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں۔ پھر وہ ایک ایک رکاوٹ کا ذکر کر کے ان کو واضح کرتا ہے۔

خواہش نفس

پہلی رکاوٹ انسان کی اپنی ہوائے نفس اور خواہش نفس ہے، جو اس کو روکتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہوائے نفس اور خواہشِ نفس، تم کو ہمیشہ غلط راستے پر لے کر جائے گی۔ اگر اس کے اوپر سوچو اور غور کرو تو حق کو پالو گے۔

استکبار

دوسری رکاوٹ استکبار ہے، جس کے معنیٰ ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ میں ہی سب کچھ ہوں اور میری رائے سب سے بہتر ہے۔ یہ بھی حق کو ماننے کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور اس کو بھی منہدم کرنے کی ضرورت ہے۔ سوسائٹی، کلچر اور آبا و اجداد بھی حق کا معیار نہیں ہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ ہم نے تو اپنے آبا و اجداد کو اسی پر پایا ہے، ہم نے تو دیکھا ہے کہ شروع سے یہ کام اسی طرح ہوتا چلا آ رہا ہے۔ قرآن نے اس کو بھی رد کر دیا۔

اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

(البقرہ۲:۱۷۰)

”اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہِ راست نہ پائی ہو، تو کیا پھر بھی یہ انھی کی پیروی کیے چلے جائیں گے۔“

اسی طرح اگر استبداد اور آمریت کو لوگوں نے عذر بنایا، تو قرآن مجید نے کہا کہ اس کے مقابلے پر کھڑے ہونا اور حق کو قبول کرنا ضروری ہے۔

گروہی عصبیت اور حسد

تیسری بات وہ یہ کہتا ہے کہ حق کے اعتراف میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ خاص

طور پہ، جن رکاوٹوں کو وہ مسترد کرتا ہے وہ گروہی عصبیت اور حسد کی رکاوٹیں ہیں۔ یہ اس راہ میں آڑے آتی ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ (البقرہ۲:۱۳۵)

''یہودی کہتے ہیں: یہودی ہو تو راہِ راست پالو گے۔ عیسائی کہتے ہیں: عیسائی ہو تو ہدایت ملے گی۔''

گویا یہ لیبل لگالو، اسے اپنے اوپر چسپاں کرلو تم صحیح راستے پر ہو گے اور حق کو پالو گے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ حق تو کسی لیبل کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ حق اور سچائی کی اپنی پہچان اور اپنی صفات ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، جو طریقہ تھا وہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور ہر ایک سے کٹ کر اللہ کا ہو رہنا۔ یہ حق کی پہچان ہے۔ یہودی اور عیسائی کہتے تھے کہ جنت میں تو وہی جائے گا، جو یہودی اور عیسائی ہوگا:

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ (البقرہ:۱۱۱)

''ان کا کہنا ہے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، جب تک وہ یہودی نہ ہو (یا عیسائیوں کے خیال کے مطابق) عیسائی نہ ہو۔''

قرآن نے کہا کہ یہ تمھاری اپنی من گھڑت خواہشیں ہیں:

تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

(البقرہ۲:۱۱۱)

''یہ ان کی تمنائیں ہیں۔ ان سے کہو، اپنی دلیل پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔''

بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ (البقرہ۲:۱۱۲)

''[دراصل نہ تمھاری کوئی خصوصیت ہے نہ کسی اور کی] حق یہ ہے کہ جو اپنی ہستی کو اللہ کو سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے۔''

یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ جس قرآن نے بار بار، اس بات کا اعلان کیا، اسی قرآن کے ماننے والوں نے حق کو ایک لیبل کے طور پر اپنے نام کے ساتھ اور گروہی عصبیت کے ساتھ وابستہ

کرلیا۔ قرآن مجید نے بار بار، اس بات کی تردید کی ہے۔ اس نے کسی جماعت، کسی تنظیم، کسی فرقے اور کسی لیبل کے ساتھ، یہاں تک کہ امت محمدیہ کے لیبل کے ساتھ بھی، اس بات کی ضمانت نہیں دی ہے کہ جس کے اوپر یہ لیبل لگا ہو وہ لازماً حق اور سچائی کے اوپر ہے۔ لہٰذا جب انسان حق اور سچائی کو گروہی عصبیت اور گروہی تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھے گا تو حق کو پائے گا اور حق کو پا کر اس کو قبول کرنا چاہیے۔

وسعت قلبی اور اعتراف غلطی

چوتھی بات، جو تصدیق حق کے ساتھ ہے، وہ یہ ہے کہ، جو آدمی حق کا متلاشی ہوگا اور رکاوٹوں کے اوپر قابو پائے گا، وہ کھلے دل کا مالک ہوگا اور اس کا دل سچی بات کے لیے ہمیشہ کھلا ہوگا۔ اس کی کیفیت وہ ہوگی، جو قرآنِ مجید نے اس طرح بیان کی ہے:

يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ط (النور۲۴:۳۵)

''جس کا تیل آپ ہی آپ بھڑکا پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے۔''

گویا حق کا طالب، قبول حق کے لیے بالکل تیار ہوتا ہے کہ آگے بڑھ کر اسے قبول کرے۔ یہ بات جہاں کائنات کی بڑی بڑی حقیقتوں اور مجموعی حق کے بارے میں صحیح ہے وہاں زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی، یہی روش ہونی چاہیے کہ آدمی کھلے دل کے ساتھ معاملہ کرے۔ معاملہ خواہ دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ، وسعت نظری اور بلند نظری کے ساتھ معاملہ کرے۔ جو بھی حق کا طالب ہوگا، حق کا جویا ہوگا، حق پرست ہوگا اور تصدیق حق کی صفت اس کے اندر ہوگی، یہ سب صفات اس کے اندر موجود ہوں گی۔ ایسے آدمی کو اپنی غلطی کے اعتراف میں کبھی تامل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ، جو آدمی حق پر ہوگا اگر وہ غلطی بھی کرے گا، تو کھلے دل کے ساتھ غلطی کا اعتراف کرے گا۔

قرآن مجید میں بار بار، اس حوالے سے آیتیں نازل ہوتی رہیں اور جو سب سے بڑا حق پرست گروہ تھا، اس سے جب غلطیاں ہوئیں تو قرآن مجید نے ان کی نشان دہی کی۔ ان کی صفت بھی بیان کی کہ وہ خود بھی استغفار کرتے رہتے ہیں اور ان کو اور کسی بھی حق پرست کو کبھی اپنی

غلطی کے اعتراف میں تامل نہیں ہوگا۔ جب آدمی ہوائے نفس، اپنی ناک اور بہت ساری چیزوں کے چکر میں پڑتا ہے تو پھر اس کو غلطی کے اعتراف میں تامل ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے انسان مطلوب کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ حق کا طالب ہوتا ہے اور اگر وہ حق سے منحرف ہو جائے، حق سے ہٹ جائے یا کوئی کام، حق کے خلاف ہو جائے تو اس کو اس کے اعتراف میں ذرہ برابر بھی تامل نہیں ہوتا۔ وہ کھل کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں منافقین کی روش یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ عذر پیش کرتے ہیں، تاویلات پیش کرتے ہیں، بہانے بناتے ہیں اور اپنے غلط اقدامات کا جواز پیش کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ایسا کہا تھا۔ جب کہ سچے آدمی کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتا ہے اور اس کے اعتراف میں اس کو کوئی باک نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر انھیں خدشہ ہو کہ ان کو سزا بھی ہو سکتی ہے اور ان پر حدود کا نفاذ بھی ہو سکتا ہے، تب بھی وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم سے یہ غلطی ہوئی اور ہم پر حد کو نافذ کر دیا جائے۔

میں نے، جن صفات کا نقشہ آپ کے سامنے کھینچا ہے یہ دراصل، اسی ایک چیز کی شاخیں ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ، اس فریم ورک میں ہر چیز اپنی جگہ پر ایک ایسی بنیادی چیز ہے کہ جس سے ہزاروں اعمال اور ہزاروں صفات کی شاخیں پھوٹتی ہیں۔

۲۔ صرف اللہ کا بن جانا

انسانِ مطلوب میں اللہ تعالیٰ کو، جو دوسری صفت درکار ہے یا، جو حق کی تلاش کا پہلا بنیادی تقاضا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کا بن جائے۔ اس لیے کہ وہی کائنات میں واحد حق ہے اور باقی ہر چیز فنا ہونے والی ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ اَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ

(لقمٰن ۳۱:۳۰)

”یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اسے چھوڑ کر، جن دوسری چیزوں کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔“

كُلُّ شَىْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ (القصص ۲۸:۸۸)

''ہر شے ہلاک ہونے والی ہے سوائے اس ذات کے۔''

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۚۖ ○ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ○ۚ (الرحمٰن ۵۵:۲۶،۲۷)

''ہر چیز، جو اس زمین پر ہے، فنا ہونے والی ہے اور صرف تیرے رب کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔''

انسان جس چیز کا بھی ہو کر رہے گا، وہ بہ ہر حال فنا ہو کر رہے گی۔ انسان کی کوششیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ چاند، سورج اور ستارے سب ڈوبنے والی چیزیں ہیں اور آدمی کو کہنا چاہیے:

لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ○ (الانعام ۶:۷۶)

''ڈوبنے والی چیزوں میں سے مجھے کوئی چیز پسند نہیں ہے۔''

مجھے تو اپنا رخ اس کی طرف کرنا ہے، جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے، جو حق کا طالب ہو، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حق کو تلاش کیا تو ان کی زبان پر یہی کلمات جاری ہوئے: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ یعنی، جو چیزیں ڈوبنے والی ہیں، ختم ہونے والی ہیں، فنا ہونے والی ہیں، میں ان کا نہیں بن سکتا، ان کو زندگی کا قبلہ اور مقصود نہیں بنا سکتا:

اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ۚ (الانعام ۶:۷۹)

''میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا، جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

اس کی تفصیل تعلق باللہ میں آئے گی۔

۳- انسانی مقام کی قدر و قیمت کا اندازہ

تیسری بات، جو حق کی تلاش کے نتیجے میں سامنے آتی ہے، وہ انسان کا اپنا مقام اور اس

کی صحیح قدر و قیمت کا احساس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی صفات بیان کی ہیں، وہاں اس نے انسان کا بھی بڑا اونچا اور بلند درجہ بیان کیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ (التین ۹۵:۴)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے، اس کو اپنی ساری مخلوقات پر فضیلت دی ہے، اس کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں دی ہیں، اس کو اپنے اعمال کے اندر خود مختار بنایا ہے، آزادی بخشی ہے، اس کو اپنے اعمال کے لیے مسئول ٹھیرایا ہے اور اس کے بدلے میں اس کے لیے ابدی جنت کا وعدہ کیا ہے۔ لہٰذا انسانِ مطلوب اپنے بارے میں بھی اس حقیقت سے شناسا ہوتا ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے کتنے بلند درجے پر فائز کیا ہے۔ اس کے اندر خود اس نے اپنی روح پھونکی ہے وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (ص ۳۸:۷۲)۔ اس کو اپنے ہاتھوں سے مٹی سے بنایا ہے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی ہے۔ پھر خلافت کے منصب پر فائز کیا۔ اسے فرشتوں کا مسجود بنایا۔ اس کے اوپر امانت کا بوجھ ڈالا اور جنت کا دروازہ کھولا، کہ زندگی کے چند لمحات محنت کر کے ابدی جنت حاصل کر سکتا ہے۔ یہ انسان کے اپنے مقام کی پہچان ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ کی پہچان اور اس کا بن جانا ضروری ہے، اسی طرح انسان کا یہ پہچاننا بھی ضروری ہے کہ، جو کچھ بھی اس کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے وہ بہت قیمتی ہے۔ اس کا جسم، اس کی عقل، اس کی صلاحیتیں اور اس کی قیمت دنیا کے اندر کوئی نہیں لگا سکتا، سوائے اس کے کہ جس نے اس کو پیدا کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں، جو آدمی دنیا میں اپنی قیمت لگواتا ہے، وہ دراصل ایک بیش بہا خزانے کو کوڑیوں کے عوض بیچ دیتا ہے۔ درحقیقت اس کی نگاہ، اس کی سماعت، اس کے دل و دماغ اور اس کے جسم و جان اور زندگی اور اس کی قدر و قیمت، اس کے خالق کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم۔ اس کے خالق نے اس کی وہ قیمت لگا رکھی ہے، جو نہ آنکھوں نے دیکھی ہے اور نہ کانوں نے سنی ہے، اور نہ دل ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ لہٰذا انسان اس بات کے لیے تیار رہے کہ وہ اپنی قیمت اپنے خالق سے وصول کرے گا۔ دنیا میں کسی سے اپنی قیمت نہیں لگوائے گا۔

ہر وہ انسان، جو اپنی قدر و قیمت کو محسوس کرے گا، اپنے اوپر اعتماد بھی کرے گا اور بھروسا بھی۔ اس لیے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دنیا کے اندر امتحان میں ڈالا ہو اور امتحان میں کام یاب ہونے کے لیے، اس کو وہ چیزیں نہ دی ہوں، جن سے وہ امتحان میں کام یاب ہوسکتا ہو۔ جو بات غور طلب اور سمجھنے کی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ عقل اور انصاف کے بھی خلاف ہوتا۔ اس لیے کہ وہ شخص امتحان میں کیوں کر کام یاب ہوسکتا ہے، جس کو پڑھایا ہی نہ گیا ہو، جس کو تربیت ہی نہ دی گئی ہو اور جس کو صلاحیتیں ہی نہ بخشی گئی ہوں۔ اس سے منصف یہ نہیں پوچھ سکتا کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا۔ اسی طرح جہاں بھی انسان کو جبر کا سامنا ہوگا اور اس کی مرضی کے خلاف، زبردستی اس سے کوئی کام کروایا جائے گا تو اس پر اس کو سزا نہیں دی جائے گی۔ البتہ یہ بات واضح ہے اور انسان کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی آزمایش اور امتحان کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے اس کو وہ سب کچھ دیا ہے اور لازماً دیا ہے، جو امتحان کا تقاضا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بغیر وہ امتحان میں کام یاب نہیں ہوسکتا ہے۔

۴- ایفائے عہد

چوتھی چیز، جو قرآن مجید بیان کرتا ہے، وہ ایفائے عہد ہے۔ قرآن مجید کردار کی بہت ساری تفصیلات بیان نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس نے بھی اپنے بیان کو ان آفاقی بنیادی چیزوں تک محدود رکھا ہے، جن پر پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اگر سورۂ بقرہ کا آغاز کیا جائے تو قرآن مجید نے سب سے پہلے، جو صفات بیان کی ہیں، ان میں جھوٹ کا ذکر کیا ہے، منافقین کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد فاسقین کا، جن کو ہدایت نہیں ملتی، اور ان کی پہلی صفت یہ بیان کی ہے:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ (البقرہ ۲:۲۷)

”جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔“

اس کے بعد ایفائے عہد کے متعلق ہدایات دی گئی ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (المائدہ ۵:۱)

”اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، بندشوں کی پوری پابندی کرو۔“

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً ﴿ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۴)

"بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی۔"

گویا دین کی پوری عمارت عہد کے اوپر قائم ہے اور مومنین کی صفت، جو قرآن مجید نے بیان کی ہے، وہ بھی امانت ودیانت اور ایفائے عہد ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿ (المعارج ۷۰:۳۲)

"جو اپنی امانتوں کی حفاظت اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔"

امانت اور عہد کا آپس میں تعلق ہے۔ امانت بھی ایک عہد ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ امانت ملنے کے ساتھ ہی انسان خود بہ خود ایک عہد میں بندھ جاتا ہے۔ امانت کو حسب وعدہ بہ حفاظت لوٹانا دراصل ایفائے عہد ہی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

لاَ اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِيْنَ لِمَنْ لاَ عَهْدَ لَهٗ.

"یعنی جس کے پاس امانت نہیں ہے اس کے پاس ایمان نہیں ہے اور جس کے پاس وفائے عہد نہیں ہے، پاسِ عہد نہیں ہے اس کے پاس دین نہیں ہے۔ دین کی عمارت تو قائم ہی وفائے عہد کے اوپر ہوتی ہے۔"

اگر غور کیا جائے تو بندگی بھی اسی پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی روز تمام انسانوں سے عہد لیا تھا:

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ (الاعراف ۷:۱۷۲)

"کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں۔"

یہ پہلا عہد تھا، جو انسان سے لیا گیا، جب کہ دوسرا عہد یہ لیا گیا:

وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ز

(المائدہ ۵:۷)

"اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو، جو اس نے تم سے لیا ہے، یعنی تمھارا یہ قول کہ: "ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔"

یہ ایمان کا عہد ہے۔ اس کے بعد انسان اپنی زندگی میں بہت سے عہد باندھتا اور عہد کرتا رہتا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ ہر عہد، جو اللہ کے نام پر باندھا جائے اور ہر وعدہ، جو آدمی کرے، اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ ساری زندگی کی اصلاح کی بنیاد عہد و پیمان پر قائم ہوتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تجارت ہو یا معیشت، خاندانی زندگی ہو یا میاں بیوی کے تعلقات، ان سب کے اندر عہد و پیمان بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ حکمران بھی عہد کرتے ہیں اور رعایا بھی عہد کرتی ہے۔ میاں، بیوی بھی ایک عہد کے نتیجے میں رشتۂ ازدواج میں بندھتے ہیں۔ اسی لیے اس کو عقدِ نکاح کہا جاتا ہے۔ عقد کے معنیٰ بھی عہد کے ہوتے ہیں۔ درحقیقت عہد کے اوپر ہی پوری زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایفائے عہد دراصل وہ چیز ہے جس سے بہت سارے اعمال اور اخلاق کا پورا فریم ورک تیار ہوتا ہے۔

۵- عدل و انصاف

اس سے اگلی چیز، جو اس کردار میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے وہ عدل و انصاف کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کی بعثت کا مقصد یہ بتایا ہے:

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ (الحدید ۵۷:۲۵)

"تاکہ لوگ انصاف کے اوپر قائم ہو جائیں۔"

اس کے بعد پھر، اس نے امت کا مقصد یہ بتایا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ

(النساء ۴:۱۳۵)

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، انصاف کے علم بردار اور خدا کے واسطے گواہ بنو۔"

امت وسط کے معنیٰ بھی لوگوں نے یہی بیان کیے ہیں کہ وہ امت، جو عدل و انصاف کے اوپر قائم ہو۔ وہ انصاف، وہ عدل اور وہ میزان، جس کے اوپر زمین و آسمان قائم ہیں۔ چناں چہ قرآن مجید نے جہاں اللہ تعالیٰ کی بے انتہا رحمت کا ذکر کیا ہے:

اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ (الرحمٰن ۵۵:۱-۲)

"نہایت مہربان [خدا] نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔"

وہاں یہ اشارہ بھی کیا ہے کہ اس نے آسمان و زمین کو انصاف پر قائم کیا ہے:

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ ٥ وَ اَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ٥ (الرحمٰن ۵۵:۸-۹)

"اس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو، انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو۔"

قرآن مجید ترازو کا جب ذکر کرتا ہے، تو اس کے معنیٰ وہ ترازو نہیں ہوتے، جس سے تول کے آدمی سودا دیتا اور خریدتا ہے بلکہ اس سے مراد اعمال، اخلاق اور معاملات ہیں۔ گویا انسان اپنے معاملات اور اخلاق میں عدل پر قائم رہے۔ اسے بھی اسی عدل کے اوپر قائم ہونا چاہیے، جس پر آسمان و زمین قائم ہیں، یہاں تک کہ دشمن بھی پکار اٹھیں کہ ہاں یہ وہ عدل ہے، جس پر آسمان و زمین قائم ہیں۔ اسی طرح انسانی معاشرہ بھی عدل و انصاف پر قائم ہونا چاہیے۔

یہ خیبر کا واقعہ ہے کہ حضور ﷺ نے کسی کو محصول وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے، جتنی بھی کھیتی تھی اس کے دو حصے کر دیے اور اپنے دشمنوں سے کہا کہ اس میں سے، جو حصہ تم چاہو اٹھا لو۔ اس پر یہودی پکار اٹھے کہ یہی وہ عدل ہے، جس پر زمین اور آسمان قائم ہیں:
اس معاملے میں قرآن مجید نے اتنی شدت کے ساتھ تاکید کی ہے کہ اگر بات بھی زبان سے نکلے تو وہ عدل کے ترازو سے ہٹی ہوئی نہ ہو۔

وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ۚ (الانعام ۶:۱۵۲)

"اور جب بات کہو انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتے دار ہی کا کیوں نہ ہو۔"

گویا خواہ رشتے داروں کا معاملہ ہو یا احباب کا، زبان سے، جو بات بھی نکلے وہ عدل و انصاف پر مبنی ہونی چاہیے۔ اگر دشمن سے بھی سابقہ پیش آئے تب بھی انصاف کا حکم ہے:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۙ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۫ (المائدہ ۵:۸)

''کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔''

دشمنی بھی تمھیں اس بات کے اوپر نہ لے جائے کہ تم دشمن کے ساتھ انصاف کا برتاؤ نہ کرو۔ اگر لوگوں نے تم کو خانۂ کعبہ سے نکالا ہے، اس کا راستہ روکا ہے، تو تمھیں اس بات کا حق نہیں ہے کہ تم بھی ان کا راستہ روکو اور ان کو بھی خانہ کعبہ سے نکال دو۔ اس لیے کہ دشمنی تم کو عدل سے نہ ہٹائے۔

اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰى ۡ (المائدہ ۵:۸)

''انصاف پر قائم رہو، یہی تقویٰ سے قریب ہے۔''

تقوے کی بنیاد پر ہی اللہ تعالیٰ نے دنیا کے اندر کام یابی کا وعدہ کیا ہے اور تقوے ہی پر اس نے جنت میں داخلے کو بھی منحصر کیا ہے۔ تقویٰ کے علاوہ نہ دنیا کے اندر غلبے اور کام یابی کا کوئی راستہ ہے، اور نہ تقویٰ کے بغیر جنت کے اندر داخل ہونے کا کوئی امکان ہے۔ لہٰذا عدل پر زور دیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ تقویٰ سے قریب ہے۔

۶- احسان

اس سے اگلی صفت، جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، وہ احسان ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ (النحل ۱۶:۹۰)

''اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔''

عدل ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر احسان کا رویہ مطلوب ہے۔ احسان یہ ہے: نرمی اور بھلائی اور حسنِ سلوک سے پیش آنا، برائی کا جواب بھلائی سے دینا، اپنے حق سے کم لینا اور دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا۔ یہ وہ چیز ہے، جس سے تعلقات اور روابط اور معاشرے اور انسان کے کردار میں چاشنی، لذت، حسن اور خوب صورتی پیدا ہوتی ہے۔ گویا عدل سے تو ڈھانچا ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر قائم ہوتا ہے۔ لیکن احسان سے اس کے اندر رنگ بھرا جاتا ہے اور خوب صورتی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں تعلقات میں پھر وہ کیفیت آتی ہے، جس

سے یہ تعلقات انسان کے لیے خوشی اور مسرت کا باعث بنتے ہیں۔ اس کے بارے میں جب ہم قرآن مجید کی روشنی میں غور کریں، تو بات بڑی آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ایک جگہ یہ فرمایا کہ:

وَ اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا (الانعام ۶:۱۵۲)

''جب بات کہو انصاف کی کہو۔''

کسی سے مقابلہ ہو، یا کوئی محاذ آرائی، یا صلح کے لیے بات چیت، بات جب بھی ہو عدل کی ہونی چاہیے۔ پھر فرمایا:

وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرہ ۲:۸۳)

''اور لوگوں سے بھلی بات کہنا۔''

یہ دوسرا حکم ہے کہ بھلائی سے، نرمی سے اور خوش اخلاقی سے بات کرو۔ یہ عدل سے بڑھ کر احسان کے اندر شامل ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ، جو لوگ تمھارے ساتھ ہوں، رشتے دار ہوں یا پڑوسی ہوں، کوئی چند لمحے کے لیے ساتھ آکر بیٹھ جائے، ان سب کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، بہتری کا برتاؤ کرو، ان کے حق سے زائد، ان کو دو اور اپنے حق سے کم لینے پر تیار رہو۔

اسی کے اندر عفو و درگزر کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو تمھیں بدلہ لینے کا حق ہے، لیکن یہ خیال رہے:

فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ (الشوریٰ ۴۲:۴۰)

''پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرلے، اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

گویا اگر تم برائی کا جواب اسی برائی سے دو تو اس کی تمھیں اجازت ہے۔ البتہ اگر تم برائی کا جواب بھلائی سے دو تو برائی اور بھلائی برابر نہیں ہوتے۔ تمھارے کٹر دشمن بھی تمھارے دوست بن جائیں گے۔ یہ قرآن مجید کی ضمانت اور اس کا وعدہ ہے کہ لوگوں کے دل تمھارے لیے موم بن جائیں گے، رام ہو جائیں گے، اگر تم برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ لیکن اس کے لیے بڑے عزم اور ہمت اور بڑے کردار کی ضرورت ہے۔

وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ○

(حٰمٓ السجدۃ ۴۱:۳۵)

"یہ صفت نصیب نہیں ہوتی، مگران لوگوں کو، جو صبر کرتے ہیں اور یہ مقام حاصل نہیں ہوتا مگران لوگوں کو، جو بڑے نصیبے والے ہیں۔"

اس کے بعد فرمایا:

لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ. (حٰمٓ السجدۃ ۴۱:۳۴)

"دونوں چیزیں برابر نہیں ہوسکتیں۔"

گویا یہ کہا جارہا ہے کہ حق یہ ہے کہ تم بدلہ لو،لیکن بدلہ اتنا ہی لو جتنی تمھارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور اسی سے لو جس نے زیادتی کی ہے۔اس کے مقابلے میں اگر تم معاف کردو اور معافی کی روش اپناؤ اور یہی بہتر ہے۔اس لیے کہ نبی کریم ﷺ کی یہی روش تھی۔اس روش سے لوگوں کے دل فتح ہوتے چلے جاتے ہیں۔

دراصل احسان سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے، جو باہمی تعلقات میں ایک لذت اور چاشنی کا باعث بنتی ہے اور اس کے نتیجے میں لوگوں کے دل جھکتے اور فتح ہوتے چلے جاتے ہیں۔ احسان کے بارے میں قرآن مجید نے صرف تاکید نہیں کی یَـاْمُرُ کے ساتھ دونوں کا ذکر ہوا ہے، یعنی واضح طور پر حکم دیا گیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل ۱۶:۹۰)

"اللہ عدل، احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔"

احسان، فرض تو نہیں ہے،لیکن احسان کا درجہ بہت بلند ہے اور اس کی بہت شدت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے۔

۷- جہاد

ساتویں چیز، جو اس کردار کے اندر مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ یہ صفات، جو قرآنِ مجید نے بیان کی ہیں، یعنی تصدیق حق، اللہ تعالیٰ کا بن جانا، ایفائے عہد اور عدل وانصاف اور احسان،

ان کو اپنی زندگی میں اور معاشرے میں، قائم کرنے کے لیے آدمی بھرپور کوشش کرے۔ چناں چہ اس نے جگہ جگہ یہ ذکر کیا ہے کہ ایمان کی تو نشانی ہی یہ ہے کہ آدمی جان اور مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کرے۔ اس لیے کہ انسان، اکیلا اپنے مقام پر اس معیارِ مطلوب پہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کو معاشرے کی ضرورت ہے۔ وہ معاشرے کا ایک فرد ہے۔ جب معاشرہ قائم ہوگا تو پھر اس کی اپنی کوشش اور ارادہ بھی رنگ لائے گا اور اس کے اندر وہ پھلے پھولے گا۔ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا، جہاں نیکی پھلے اور بدی دبے، خیر پھیلے اور شر مٹے، اس کے لیے جہاد کرنا، اپنا وقت لگانا، جان و مال لگانا اور قربانی دینا، یہ وہ چیزیں ہیں، جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس جہاد کے نتیجے میں مجاہدین سے بہترین اجر کا وعدہ کیا ہے۔ سورۂ نساء میں، جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے اس کے لیے جنتیں اور نعمتیں اور ہمیشہ قائم رہنے والی نعمتیں اور ہمیشہ اس میں رہنا اور اللہ کی رحمت اور اس کے رزق کا تذکرہ، ایک ہی آیت میں کیا گیا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ وہ تمام صفات، جو مطلوب ہیں اور جن کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ اسی جہاد کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ گویا اگر انسان جدوجہد کرے، قربانی دینے کو تیار ہو اور اللہ کی راہ میں جان و مال لگائے، تو یہ ان صفات کو حاصل کرنے اور ان کو قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

۸۔ خود احتسابی

آخری چیز، جو قرآن نے کثرت سے بیان کی ہے، وہ خود احتسابی اور استغفار کی صفت ہے۔ اس لیے کہ اس سب کے باوجود قرآن کے بہ قول:

وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۝ (النساء:۲۸)

''کیوں کہ انسان کم زور پیدا کیا گیا ہے۔''

اور وہ آزمائش میں ڈالا گیا ہے:

زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ (آل عمران۳:۱۴)

"لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس: عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آیند بنادی گئی ہیں۔"

ان ساری چیزوں کی خواہشیں انسان کے لیے بڑی بھلی بنادی گئی ہیں۔ عورتیں، اولاد، سونا، چاندی، مال و دولت، گھوڑوں اور کاروں کی، اور پیداوار اور فیکٹریوں کی، سب کی محبت اس کے اندر ڈالی گئی ہے۔ یہ ایک کڑا امتحان ہے اور اس میں یہ ضروری اور ناگزیر ہے کہ انسان لغزش کھائے، پھسل جائے اور گر پڑے۔ اسی لیے اس نے استغفار کی صفت پر بار بار زور دیا ہے۔

استغفار کی صفت بھی اس میں پیدا ہوگی، جو حق کا طالب ہوگا، حق کو مانے گا، حق کو قبول کرے گا، حق کے اوپر جم کے کھڑا ہوگا اور پھر اس سے غلطی ہوگی تو اس کے اعتراف میں اسے ذرا بھی تامل نہیں ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اعتراف کرے گا، جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور جو کچھ سینوں کے اندر ہے اسے بھی جانتا ہے اور جیسی نیت ہو اس کو بھی جانتا ہے اور جو اعمال دوسروں کی نگاہوں سے چھپے ہوئے ہوں ان کی بھی اسے خبر ہے۔ استغفار کو اس نے لازمی صفت قرار دیا ہے اور خاص طور پر، جو لوگ راہِ حق میں کام کر رہے ہیں ان کے لیے تو وہ اس صفت کو اتنا ضروری قرار دیتا ہے کہ اس کے بغیر حق کا سفر طے نہیں ہوسکتا۔ استغفار اور خود احتسابی کی صفت ایک فرد ہی کے لیے لازم نہیں ہے، بلکہ اس نے جماعتوں اور قوموں سے بھی مطالبہ کیا ہے کہ اجتماعی طور پر تم استغفار کی صفت اختیار کرو:

وَ تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ٥

(النور ۲۴:۳۱)

"اے مومنو! تم سب مل کر اللہ سے توبہ کرو، توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔"

اس خود احتسابی پر اس نے صرف آخرت میں مغفرت کا وعدہ نہیں کیا، بلکہ دنیا میں بھی بلندی اور کامرانی اور آسایش اور فرماں روائی کا وعدہ کیا ہے۔ اس کا وعدہ ہے کہ اگر تم استغفار کرو گے، تو اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی برسائے گا، زمین سے کھیتی اگائے گا، فصلوں کے اندر فراوانی دے گا، مال اور اولاد میں ترقی دے گا۔ یہ وعدے اس نے اس جماعت اور

گروہ اور اس قوم سے کیے ہیں، جس کے اندر اتنی جرأت ہو کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کر سکے اور ان کی اصلاح کر سکے۔

یہاں ضمناً ایک سوال کا جواب بھی دیتا چلوں۔ بعض دفعہ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے اندر آج کافر قومیں کیوں غالب ہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہے کہ، جو قومیں خدا سے بے نیاز ہیں، ان میں ایک حد تک وہ صفات پائی جاتی ہیں، جو خدا کو مطلوب ہیں اور وہ اجتماعی غلطیوں کا اعتراف، اجتماعی طور پر کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔ ان کا صدر ہو یا وزیر اعظم، یا کوئی وزیر یا کوئی جماعت، وہ خود احتسابی کی اہمیت سے بہ خوبی واقف ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی ۴۰ سال کے بعد کوئی قرارداد پاس کر سکتی ہے کہ ۴۰ سال پہلے ہم سے یہ غلطی ہوئی، ہمارے لیڈروں نے یہ غلطی کی، ہم یہاں اپنی راہ سے منحرف ہو گئے۔ اس کی مثالیں موجود ہیں اور یہ چیزیں ریکارڈ پر موجود ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے بے نیاز ہو کر بھی اس راز کو بہ خوبی جانتے اور سمجھتے ہیں کہ خود احتسابی کے بغیر دنیا کے اندر کوئی ترقی ممکن نہیں۔ یہ تو دنیا کی بات ہے، جب کہ آخرت کے اندر تو سارا انحصار ہی خدا سے مغفرت طلب کرنے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے آگے استغفار، اپنی غلطی کا احساس، اس پر ندامت، اس کی تلافی کی کوشش اور اس کا اعتراف، یہ وہ چیزیں ہیں، جو استغفار کے اندر شامل ہیں۔

قرآن مجید کی، جس آیت کو بھی ان صفات کی روشنی میں دیکھیں، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، وہ کہیں نہ کہیں سے انھی آٹھ بنیادی صفات کے فریم ورک میں فٹ ہو جائے گی۔ نکاح و طلاق کی ہدایات اور احکام بھی عدل و احسان کے اوپر قائم ہیں۔ اگر اٹھنے بیٹھنے کے آداب ہوں، تو وہ بھی اسی طرح ہیں کہ انسانوں کو تکلیف نہ پہنچائیں، ان کے ساتھ اچھا معاملہ ہو اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی ہدایت ہے۔ اجتماعیت کے آداب ہیں، تو وہ بھی انھی اصولوں کے اوپر قائم ہیں اور جگہ جگہ اس نے انھی کی تاکید کی ہے۔ قرآن مجید نے اپنا بیان صرف بنیادی باتوں تک محدود رکھا ہے، جب کہ تفصیلات احادیث کے اندر موجود ہیں۔ اگرچہ احادیث کے اندر بہت ساری تفصیلات دی گئی ہیں لیکن تقریباً وہ سب کی سب انھی باتوں کے فریم ورک کے اندر

فٹ ہوجاتی ہیں۔ان میں سے بعض باتیں تفصیل طلب ہیں اور اپنی جگہ الگ موضوع رکھتی ہیں۔ مثلاً احسان، یعنی انسان کے ساتھ سلوک، وہ الگ گفتگو کا موضوع ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بن جانا، یہ تعلق باللہ کا موضوع ہے۔اسی طرح جہاد اپنی جگہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے اور اس کی تفصیل راہِ منزل کی گفتگو میں آئے گی۔ البتہ بنیادی فریم ورک انھی صفات پر رہے گا۔اس کو سمیٹا بھی جاسکتا ہے اور پھیلایا بھی جاسکتا ہے۔ میں نے جن چیزوں کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھا، ان کو یہاں سمیٹ کر آپ کے سامنے بیان کردیا ہے۔ یہ خدا کے نزدیک انسانِ مطلوب کی بنیادی صفات کا ایک مختصر خاکہ ہے، جو میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے۔اسے کردار سازی اور سیرت سازی کے دوران پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور اسی کو اپنی سعی وجدوجہد کا مرکز وہدف بنانا چاہیے۔